

پاکستان میں اسلام

محمد سرور

اسلامی علوم کے قدیم مراکز

شاہن مغلیہ سے پہلے اور ان کے عہد حکومت میں اُن علاقوں میں، جن سے آج مغربی پاکستان عبارت ہے، مٹان، ٹھٹھہ، لاہور اور سیال کوٹ وغیرہ بڑے عظیم علمی مراکز تھے، جہاں دور و نزدیک سے لوگ تحصیل علم کے لئے آتے اور ان شہروں کے علماء و فضلاء اور ان کی درس گاہوں سے فیض حاصل کرتے جب مغل سلطنت کا زوال شروع ہوا تو ایک طرف بیرونی حملوں اور دوسری طرف اندرونی خلفشار سے اس پورے خطے میں بڑی افرا تفری پھیل گئی۔ اس سیاسی ہل چل اور معاشرتی اضطراب کا علمی زندگی پر بھی اثر پڑا۔ وہ درس گاہیں ختم ہو گئیں جن سے فیض علمی جاری تھا۔ وہ علماء و فضلاء نہ رہے جن سے درس و تدریس کی مجالس قائم تھیں۔ برطانوی عہد کے پورے سو سال میں بھی اُن علاقوں میں دینی تعلیم کی وہ روایات جو کبھی مٹان، ٹھٹھہ، لاہور اور سیال کوٹ سے وابستہ تھیں، زندہ نہ ہو سکیں اور یہاں کوئی بڑی دینی درس گاہ اور دارالعلوم وجود میں نہ آ سکا جس کا شمار بڑے عظیم پاک و ہند کے قابل ذکر دینی مراکز میں ہوتا۔

دینی تعلیم کا احیا اور درس گاہوں کا قیام

۱۸۵۷ء کی ہیم گریٹ تباہی و بربادی کے بعد دینی تعلیم کا جو نئے سرے سے احیا ہوا تو اس کے سلسلے مراکز ان علاقوں ہی میں بنے جو آج ہندوستان میں ہیں۔ سب سے پہلے دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں آیا۔ اسی کے نمونے پر سہارن پور میں مظاہر العلوم کی بنیاد رکھی گئی۔ پھر ندوۃ العلماء کی تحریک چلی جس کے نتیجے میں لکھنؤ میں دارالعلوم قائم ہوا۔ دیوبند کی طرز پر، لیکن اس سے بہت کم درجے کے برعظیم پاک و ہند میں ہزاروں دینی مدارس وجود میں آئے۔ لیکن ان سب کا مریخ اور قبلہ مقصود دیوبند ہی رہا۔ دیوبند کا نصاب، اس کے شیوخ اور اس کی روایات ان سب مدارس کے لئے ایک مثال حیثیت رکھتے

تھے اور یہ اس لئے کہ ان مدارس کے بانی اکثر و بیشتر دارالعلوم دیوبند ہی کے فارغ التحصیل ہوتے تھے۔

اسلامی لٹریچر کی نشر و اشاعت

دینی دارالعلوموں اور درس گاہوں کے علاوہ جب دینی و اسلامی لٹریچر کی نشر و اشاعت ہوئی تو اس کے مراکز بھی دہلی، دیوبند، لکھنؤ اور اعظم گڑھ وغیرہ تھے۔ بے شک لاہور کو بھی ان مراکز نشر و اشاعت میں شامل کیا جاسکتا ہے، لیکن اس معاملے میں بہ حیثیت مجموعی اس کا دائرہ کار کچھ محدود ہی رہا۔ پُرانی ضرورتوں کو پورا کرنے والا دینی لٹریچر زیادہ تر دیوبند اور دہلی سے شائع ہوا کیا، اور سیرت نبوی، خلفاء، صحابہ، تابعین وغیرہ کے حالات اور عام تاریخ اسلامی پر اس مدت میں دارالمصنفین اعظم گڑھ نے جو لٹریچر شائع کیا، پشاور سے لے کر مدراس تک شاید ہی کوئی تعلیم یافتہ مسلم گھرانہ ایسا ہوگا جہاں یہ نہ پہنچا ہو۔ ————— کچھ عرصہ بعد دارالعلوم دیوبند کے بعض فارغ التحصیل حضرات نے دہلی میں مدوۃ المصنفین قائم کیا، اور وہاں سے بھی دینی و اسلامی کتابیں شائع ہوئیں۔

مختصراً بر عظیم کی آزادی کے بعد جب پاکستان کی اپنی ایک مستقل مملکت وجود میں آئی تو جہاں تک دینی تعلیم کی درس گاہوں اور دارالعلوموں اور دینی و اسلامی لٹریچر کی اشاعت کا تعلق ہے، گو ہم ان میں بالکل کورے تو نہیں تھے، لیکن مقابلتاً ہندوستان کے مسلمانوں سے بہت پیچھے تھے۔ اس خطے میں کوئی بڑا دینی دارالعلوم نہ تھا۔ اسی طرح ہندوستان کے تصنیفی و اشاعتی اداروں کے برابر نہ سہی، ان سے کچھ کم درجے کا بھی یہاں کوئی ادارہ کام نہیں کر رہا تھا۔

نئی دینی درس گاہیں

پاکستان کا قیام جھوڑے مسلمانوں کے مذہبی و سیاسی شعور کا عمل اظہار تھا۔ چنانچہ تقسیم بر عظیم کے وقت پاکستان پر ایک بارگی جو مصائب ٹوٹ پڑے تھے، یہ مسلمان عوام کا مذہبی جذبہ ہی تھا جو اس وقت نومو لو د مملکت کا سہارا بنا اور اس کی وجہ سے پاکستان جان لیوا خطرات سے عہدہ برآ ہو سکا۔ مسلمان نامید نہ ہوئے اور کمر ہمت باندھ کر مصائب کا مقابلہ کر سکے۔

یہ زمانہ بڑا نازک تھا۔ انتقال آبادی کی وجہ سے نظم و نسق ابھی ٹھیک نہیں ہو پایا تھا۔ اس پر ٹپے مہاجروں کی ہزار ہا کی تعداد میں آمد شروع ہو گئی۔ بہر حال سب کی کوششوں اور تعاون سے یہ خطرناک دور گزر گیا۔ لیکن واقعہ یہ ہے اس میں سب سے نمایاں کردار عوام کے مذہبی جذبہ کا تھا۔

اس صورت حال میں یہ ضروری تھا کہ جھوٹے مسلمانوں کے مذہبی جذبہ کی تسکین اور اس کی صحت مند نشوونما کے لئے اس مملکت میں سازگار حالات پیدا کئے جاتے۔ ہندوستان کو چھوڑ کر آنے والوں میں سے ایک خاصی تعداد علمائے کرام اور دینی مدارس کے اساتذہ کی بھی تھی۔ ان حضرات نے جہاں بھی حالات سازگار پائے، دینی مدرسے قائم کر کے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ تقسیم سے قبل سابق صوبہ سرحد سے طالب علموں کی ایک بہت بڑی تعداد دارالعلوم دیوبند جایا کرتی تھی۔ ظاہر ہے ۱۹۴۷ء کے بعد یہ ممکن نہیں رہا تھا۔ دارالعلوم دیوبند ہی کے ایک عالم اور مدرس نے ضلع پشاور میں اکوڑہ کے مقام پر دارالعلوم حقانیہ کی بنیاد رکھی جو اس وقت اُس نواح کی سب سے بڑی دینی درس گاہ ہے اور کثیر التعداد طلبہ و ماں زیر تعلیم ہیں۔ اسے اگر صوبہ سرحد کا دارالعلوم دیوبند کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ خاص لاہور میں جامعہ اشرفیہ قائم کی گئی۔ اسی طرح ملتان میں ایک سے زیادہ دارالعلوم وجود میں آ گئے۔ کراچی میں اس وقت کئی دارالعلوم ہیں جہاں دیوبندی فضلاء تعلیم دیتے ہیں۔ سندھ کے کئی شہروں میں دینی دارالعلوم کھل گئے ہیں۔

غرض جہاں تک دینی تعلیم کا تعلق ہے، ان بیس سالوں میں ملک میں نجی طور پر اتنے دینی مدرسے، درس گاہیں اور دارالعلوم قائم ہو چکے ہیں کہ ۱۹۴۷ء میں اس سلسلے میں جو سخت کمی محسوس ہوتی تھی وہ بالکل نہیں رہی، اور اس اعتبار سے پاکستان خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا ہے۔ ان دارالعلوموں میں سے بہت سوں کی اپنی شان دار عمارتیں ہیں اور ان کی مالی حالت بہت اچھی ہے۔

مغربی پاکستان کے اکثر شہروں میں غیر مسلم آبادی کافی تعداد میں تھی۔ ان کے جانے کے بعد ان کی جگہ جو مسلمان آباد ہوئے تو ان کے لئے مسجدیں نہیں تھیں جہاں وہ نمازیں ادا کر سکتے۔ اس عرصے میں بہت سے شہروں میں نئی مسجدیں بن گئی ہیں جو بڑی کشادہ، عالی شان اور خوب صورت ہیں۔ ان مسجدوں میں باہوم درس قرآن ہوتا ہے اور وہ اپنے علاقے کی دینی سرگرمیوں کا مرکز ہیں۔

یہ سب کچھ عام مسلمانوں کی مالی مدد اور علماء کی کوششوں سے ہوا اور یہ ایک طرح سے عوام کی مذہبی زندگی کا مظہر ہے۔

ادارۂ ثقافت اسلامیہ

اس دوران میں متعدد ایسے ادارے بھی وجود میں آئے جنہیں حکومت کی طرف سے امداد ملتی تھی

اور انہوں نے دینی زندگی کے علمی اور ثقافتی پہلوؤں کو ترقی دینے کی کوشش کی۔ ان اداروں میں سے سب سے پہلا ادارہ ثقافت اسلامیہ ہے۔ اس کی بنیاد ۱۹۵۰ء میں رکھی گئی۔ قیام پاکستان کے بعد جتنے بھی دینی مدارس اور دارالعلوم کھولے گئے ان میں تمام تر پرانی طرز کی دینی تعلیم ہوتی ہے اور ان کا نصاب تعلیم بھی وہی پرانا ہے۔ ان درس گاہوں نے اپنے ہاں نئے علوم داخل کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ اب اگر ہم اسی پر اکتفا کر لیتے اور دینی ذہن صرف قدیم تک محدود ہو کر رہ جاتا تو یہ پاکستان میں اسلام کے مستقبل کو تاریک اور اس کی آئندہ ترقی کی راہ کو مسدود کرنے کا باعث ہوتا۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ اور اس جیسے دوسرے اداروں نے اس عرصے میں یہ ایک بہت بڑی خدمت کی ہے کہ انہوں نے اسلامی ذہن کو جامد نہیں ہونے دیا اور مسلمانوں کے سامنے نئے دینی افکار پیش کر کے انہیں سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ قدیم طبقہ کو یہ کچھ بُرا تو لگا لیکن خود اس کی بقا اور اصلاح کے لئے یہ ضروری تھا۔

ادارہ ثقافت اسلامیہ نے ان برسوں میں اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں کافی کتابیں شائع کی ہیں آج کی زندگی کا شاید ہی کوئی اہم موضوع ہو جس پر ان میں بحث نہ کی گئی ہو اور اسلام کے نقطہ نظر سے اس کے حسن و قبح کو سامنے نہ لایا گیا ہو۔ قدیم کو نئے رنگ میں پیش کیا گیا ہے اور جدید کا قدیم روایات کی روشنی میں جائزہ لیا گیا ہے۔ بے شک اس ادارہ کی طرف سے شائع کردہ بعض کتابوں پر اعتراضات ہوتے اور قدیم مسلک کے بعض علماء نے اس کی تجدیدی سرگرمیوں کو ناپسند کیا، لیکن اس سے اتنا تو ہوا کہ ان حضرات کو اس امر کا احساس ہوا کہ ملک و قوم کو یہ مسئلے بھی درپیش ہیں اور ان پر انہیں غور کرنا ہو گا۔

ہمارے ہاں فکر کی کشتی نازک کوراں کرنے میں ادارہ ثقافت اسلامیہ کا بڑا حصہ ہے کیوں کہ وہ اس میں پیش رو ہے اس لئے وہ سب سے بڑھ کر تعریف کا مستحق ہے۔

ادارہ ثقافت اسلامیہ کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ وہ اسلام کے حقائق کو جدید ذہن کے سامنے پیش کرے اور مسلمان نوجوانوں کو اسلام کی عقلی، ثقافتی اور روحانی روایات سے متعارف کرائے۔ ادارہ نے اس دوران میں یہ کوشش کی ہے کہ آج سائنسی اور مذہبی نقطہ ہائے نظر میں جو نزاع چل رہا ہے، اسے حل کرے۔ اس کے پیش نظر یہ ہے کہ وہ اسلام کا ترقی پسند، عقلیت پر مبنی اور حقیقت پسندانہ تصور سامنے لائے اور اس وقت جو مسائل ہیں درپیش ہیں ان کے بارے میں اسلامی نقطہ نظر بتائے۔

قدیم طرز کے مکاتب خیال اور دینی درس گاہوں کے پہلو پہ پہلو اس قسم کے اداروں کی ضرورت خاص کر پاکستان جیسے ملک میں تھی۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ نے بہت حد تک اس ضرورت کو پورا کیا ہے۔

ادارہ تحقیقات اسلامی

اسی ضرورت کے پیش نظر ۱۹۶۰ء میں ایک ادارہ، ادارہ تحقیقات اسلامی کے نام سے قائم کیا گیا۔ اس کا قیام دستور پاکستان کی ایک دفعہ کے تحت عمل میں آیا جس میں یہ صراحت کی گئی ہے کہ ”صدر مملکت اسلامی تحقیقات اور اعلیٰ سطح پر اسلام کے مطالعہ تعلیم کی غرض سے ایک ادارہ قائم کرے گا تاکہ وہ خالص اسلامی بنیادوں پر مسلم معاشرہ کی تشکیل میں مدد دے سکے۔“ ادارہ تحقیقات اسلامی کے سرپرست خود صدر مملکت ہیں۔

اس ادارہ کے یہ مقاصد متعین کئے گئے ہیں :

۱: اسلام کی بنیادی تعلیمات کو عقلی اور آزادانہ فکری پیرائے میں پیش کرنا اور مبنی جملہ اور چیزوں کے اسلام نے انسانی اخوت، رواداری اور معاشرتی انصاف کے جو بنیادی اصول بتائے ہیں ان پر خاص کر زور دینا۔

۲: اسلام کی تعلیمات کی ایسی تعبیر کرنا کہ جدید زمانے کی عقلی اور سائنسی ترقی کے پس منظر میں اسلام کا تخلیقی اور فعال کردار واضح ہو سکے۔

۳: انسانی فکر، سائنس اور ثقافت کی ترقی میں اسلام نے جو کچھ کیا ہے اس کی اس طرح تحقیق کرنا کہ مسلمان ان علوم و فنون میں آج متنازعہ جگہ لے سکیں۔

۴: اسلامی تاریخ، فلسفہ، قانون اور فقہ اور اصول فقہ میں خصوصی تحقیقات کا انتظام کرنا۔

پاکستان کے دستور میں ایک دفعہ یہ ہے کہ ملک میں کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں بنے گا اور جو قوانین پہلے سے چلے آتے ہیں انہیں کتاب و سنت کے مطابق بنایا جائے گا۔ ادارہ تحقیقات اسلامی کا ایک کام یہ ہے کہ وہ اس سلسلے میں حکومت کی مدد کرے چنانچہ اس کا ایک قانونی شعبہ ہے جو ہر مسئلے پر جو ادارہ کو بھیجا جاتا ہے، فقہ اسلامی کا نقطہ نظر فراہم کرتا ہے۔ اس شعبے کے ارکان جدید قانون پر بھی نظر رکھتے ہیں اور فقہ اسلامی پر بھی انہیں عبور حاصل ہے

ادارہ کا ایک اہم مقصد اسلامی علوم و فنون پر تحقیقات کرنا ہے۔ ابھی حال ہی میں ادارہ کے ایک کن

نے صدر اسلام میں اصول فقہ کا ارتقا پر تحقیقی مقالہ لکھا ہے جسے کراچی یونیورسٹی نے منظور کیا اور اس پر صاحب موصوف کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی گئی۔ اب وہ رکن "اجماع" پر کام کر رہے ہیں۔ ادارہ کی طرف سے ایک کتاب "مجموعہ قوانین اسلامی شائع ہوئی ہے جس میں نکاح، طلاق اور اس طرح کے مسائل پر مختلف مذاہب فقہ کی آراء کو مدون کیا گیا ہے۔

ادارہ تحقیقات اسلامی اس امر میں کوشاں ہے کہ فقہ، کلام اور غور و فکر کے طریقوں میں پھیل پانچ چھ صدیوں میں جو تہنگی اور جہود پیدا ہو گیا ہے اس میں وسعت اور آزادی خیال آئے، اور ہم اسلام کے اس دور سے صداقت اور روشنی حاصل کریں جب مسلمان تمام علوم و فنون میں سب سے آگے تھے اور انھوں نے فکر و عمل اور ثقافت میں پوری دنیا کی رہنمائی کی تھی۔

محکمہ اوقاف

ان بیس سالوں میں دینی و اسلامی محاذ پر سب سے بڑا کام جو ہوا وہ مغربی پاکستان میں محکمہ اوقاف کا قیام ہے۔ ۱۹۲۲-۱۹۲۳ء کے بعد جب پنجاب میں سکھوں نے گوردواروں کو منہتوں کے ذاتی قبضے سے نکال کر انہی ایک نمائندہ جماعت کے سپرد کر دیا اس وقت سے مسلمان بھی یہ سوچ رہے تھے کہ ان کے اوقاف کا بھی ایسا انتظام ہو جائے اور ان کی آمدنیاں متولیوں کی جیبوں میں جانے کے بجائے ملی مصالح پر صرف ہوں۔ مسلمانوں کی یہ دیرینہ آرزو ۱۹۶۰ء میں جا کر پوری ہوئی۔ ایک قانون کے ذریعہ وہ تمام اوقاف جو مساجد، مزارات اور درگاہوں سے متعلق تھے، ان کو محکمہ اوقاف کے تحت کر دیا گیا۔ اب محکمہ ہی ان کا انتظام کرتا اور ان کی آمدنیوں کو صرف کرتا ہے۔

اس مدت میں محکمہ اوقاف نے ایک تو یہ کیا کہ مزارات کے نظم و نسق میں کافی اصلاحات کر دی ہیں اور بعض مزاروں پر عرس کے موقع پر جو عام مغرب اخلاق حرکات ہوتی تھیں ان کا قطع قمع کر دیا ہے۔ اب ان مزارات کی آمدنی مفید کاموں پر صرف ہوتی ہے جس کی سب سے عمدہ مثال داتا گنج بخش کے مزار کی ہے۔

جامعہ اسلامیہ

ایک اور اہم مسئلہ جس سے ہماری پوری دینی زندگی کی فلاح و بہبود اور اس کی ترقی وابستہ ہے مساجد کے ائمہ و خطباء کا ہے۔ اس سلسلے میں پہلے تو محکمہ اوقاف نے کونٹہ میں ایک اکیڈمی قائم کی جو ائمہ و خطباء کو ضروری تربیت دیتی تھی۔ اب بہاول پور میں جامعہ اسلامیہ اور اس کے ساتھ ہی ائمہ و خطباء کے لئے

تربیت گاہ ہے۔ جامعہ اسلامیہ کا قیام دینی تعلیم کو نئے قالب پر ڈھالنے اور اسے قدیم علوم کے ساتھ ساتھ جدید علوم کو جمع کرنے کی ایک تسخیر گمشدہ ہے۔ یہ جامعہ ابھی ابتدائی منازل میں ہے۔ جیسے جیسے عام دینی منکر میں آزادی اور کشادگی پیدا ہوگی اور مذہبی زندگی پر ایک خاص طبقہ، علما کا اس وقت جو تسلط ہے وہ کمزور ہوگا، اس جامعہ کی افادیت اور اہمیت کا احساس بڑھے گا۔

شاہ ولی اللہ اکیڈمی

سندھ کے ضلع ٹھٹھہ میں ایک بزرگ اپنی نذر علی الامنی اس مقصد کے لئے وقف کر گئے تھے کہ اس کی آمدنی سے حضرت شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کی نشر و اشاعت کی جائے۔ محکمہ اوقاف نے اس مقصد کی تکمیل کے لئے ۱۹۶۳ء میں حیدرآباد میں شاہ ولی اللہ اکیڈمی قائم کی۔ یوں تو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے نام نامی اور ان کی تصنیفات و تعلیمات کا پہلے ہی سے چرچا تھا اور نہ صرف بزرگ بلکہ باہر کی اسلامی دنیا بھی ان کے افکار کی قدر کرتی تھی، لیکن شاہ ولی اللہ اکیڈمی کے قیام سے فائدہ یہ ہوا کہ فکر ولی اللہ کو ایک تحریک کی صورت میں فروغ پانے کے لئے مواقع میسر آ گئے۔ اس اکیڈمی نے ایک ماہنامہ جاری کیا جو حضرت شاہ صاحب اور ان کے خاندان و علمی کے افکار اور تعلیمات کی اشاعت کے لئے وقف ہے۔ اسی ماہنامہ کی بدولت شاہ صاحب اور ان کے توسط سے محکمہ اوقاف کی اس دینی خدمت کا ذکر بزرگ عالم کے ہر اسلامی ادارہ تک پہنچا ہے جہاں کہ یہ رسالہ جاتا ہے۔

مسلمانوں کو نئے سرے سے حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے فکر دینی کی طرف متوجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ فکر تمام ماضی کا جامع ہے۔ اس میں بڑی وسعت ہے۔ وہ سب مذاہب فقہ و کلام و تصوف کو ملاتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس میں نئی ترقیوں کو اپنانے اور انہیں اپنے اندر سمونے کی غیر معمولی صلاحیت ہے۔ وہ مسلمانوں کے تمام فرقوں کو ایک نقطہ اشتراک پر لاسکتا ہے اور جدید سائنس و فلسفہ کے وہ افکار جن کا آج دور دورہ ہے، شاہ صاحب کی اسلام کی تعبیر میں ان کے لئے بھی وسعت ہے۔ اس بنا پر شاہ ولی اللہ اکیڈمی قائم کر کے محکمہ اوقاف نے ایک بڑی خدمت کی ہے۔

تصوف کی بعض بنیادی اور بڑی اہم کتابیں نایاب تھیں۔ محکمہ اوقاف نے ان کی اشاعت کا بھی انتظام کیا۔ ان میں سے بعض کتابیں چھپ گئی ہیں اور بعض زیر طباعت ہیں۔

اسلامیات کی تعلیم | قیام پاکستان کے بعد اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اسلامیات کی

تعلیم کا باقاعدہ انتظام کیا گیا ہے اور تمام یونیورسٹیوں میں مستقل شعبہ ہائے اسلامیات قائم ہیں۔ ان میں بی۔ اے کے بعد داخلہ ہوتا ہے اور فارغ التحصیل طلبہ کو ایم۔ اے کی ڈگری ملتی ہے۔ یہی فارغ التحصیل اسکولوں اور کالجوں میں اسلامیات کی تعلیم دیتے ہیں۔

امید ہے اس طرح قدیم اور جدید کے درمیان جو خلیج حائل ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ قدیم تعلیم پائے ہوئے جدید علوم اور جدید زمانے کی ضرورتوں اور تقاضوں سے بے خبر ہیں اور جدید تعلیم پائے ہوئے قدیم کو نہیں جانتے۔ بہ تدریج پُر ہوتی جائے گی، اور وہ وقت آجائے گا کہ پاکستانی مسلمان کی شخصیت صحیح معنوں میں قدیم اور جدید کی جامع ہوگی، اور اس وقت علماء اور جدید تعلیم یافتہ طبقے میں جو بُعد ہے وہ ختم ہو جائے گا۔

قدیم اور جدید میں ہم آہنگی کی ضرورت

قدیم طرز پر دینی تعلیم دینے والے دارالعلوم اور مدارس اگر اپنی اسی روش پر مصر رہے کہ ان کے نصاب ہائے تعلیم میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی اور وہ اپنی حدود میں کوئی جدید علم، کوئی جدید فکر اور کوئی جدید اسلوب زندگی گھسنے نہیں دیں گے تو یہ ان کے حق میں اچھا نہیں ہوگا، اور آہستہ آہستہ ان کا وجود بے کار محض ہو جائے گا۔ فطرت کا یہ اصول ہے کہ جو چیز بے کار ہو جائے وہ ختم ہو جاتی ہے۔ اگر قدیم طرز کی ان درس گاہوں نے اپنے آپ کو نئے حالات کے مطابق نہ ڈھالا اور نئے علوم کے لئے اپنے دروازے نہ کھولے تو ان کا زیادہ دیر باقی رہنا مشکل ہے۔

سوال یہ ہے کہ جب جدید اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اسلامیات کی تعلیم ضروری قرار دی گئی ہے اور طالب علم اسلامیات میں ایم۔ اے کر سکتے ہیں تو قدیم طرز کی دینی درس گاہیں کیوں اپنے ہاں ایسے جدید علوم نہ پڑھائیں جو آج ضروری ہو گئے ہیں اور جن کے بغیر نہ اس زمانے کو اور اس کی ضرورتوں کو سمجھا جاسکتا ہے اور نہ آدمی خود اپنے لئے اور قوم و ملک کے لئے مفید ہو سکتا ہے۔

پوری دنیا نے اسلام میں دُور رس تبدیلیاں آچکی ہیں۔ افغانستان اور یمن جیسے ملک جنہیں نئے زمانے کی ہولناکی نہیں لگی تھی بدل رہے ہیں۔ ان حالات میں ہمارے ہاں قدیم اور جدید گروہوں کا برسرِ پیکار ہونا انتہائی افسوس ناک ہے۔ آج مسلمانوں کو فکری، سماجی، اقتصادی اور سیاسی ان سب محاذوں پر بڑے سنگین چیلنجوں کا مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے اور ان سے وہ صرف اسی طرح عہدہ برآ ہو سکتے

ہیں کہ وہ اپنے ماضی اور حال کو ہم آہنگ کریں اور بہتر مستقبل کی راہ نکالیں۔

پاکستان کے مسلمان قدیم اور جدید کی اس خلیج کو جتنی جلد بھریں ان کے لئے اچھا ہے۔

ہندوستان کے ایک مصنف جو جمعیتہ العلماء ہند کے انگریزی رسالہ کے ایڈیٹر ہے، اور

اب وہ ایک قوم پرست مسلمان ادارے میں کالج کے پرنسپل ہیں، اپنی ایک کتاب میں جو موصوف نے میک گل یونیورسٹی (کینیڈا) میں تحریر کی، لکھتے ہیں:-

”اگر پاکستان آگے چل کر اسلام کی ایک ایسی نئی تعبیر پیش کرنے میں کامیاب ہوتا ہے جو ایک

طرف اسلام کی صدیوں پرانی تاریخی روایات کے تمام بہترین اور صحت مند ترین عناصر

کی حامل ہو اور دوسرے طرف وہ ان چیلنجوں کا، جو آج کے زمانے کے ہیں، عقلی لحاظ سے

مناسب جوابات فراہم کرے تو اس صورت میں پاکستان کے قیام اور اس کے نتیجے میں

مسلمانان ہند کو جن مصائب سے گزرنا پڑا، اس کا معقول جواز نکل سکتا ہے۔“

اسی ضمن میں مصنف نے یہ بھی لکھا ہے:-

”یقینی طور سے پاکستان کے صرف اسی پنج پر ارتقاء ہی میں بحیثیت ایک مسلم سلطنت کے

اس کی طاقت و شوکت کا انحصار ہے۔ اقبال کے خواب بھی اسی طرح عمل جامہ پہن سکتے

ہیں اور نئے ہندوستان کے مسلمان شہریوں کے لئے بھی یہی چیز وجہ سکون ہو سکتی ہے۔ پاکستان

کے معرض وجود میں آنے کا جواز اس میں ہے کہ وہاں متوازن اور ہم آہنگ جدید اسلام پھیلے

پھوٹے جو ایک طرف اپنے شان دار ماضی کے لئے باعث فخر ہو اور دوسری طرف بیسیوں

صدی کے چیلنجوں کے مقابلے کی صلاحیت رکھتا ہو۔“

ایک متوازن، ہم آہنگ، ترقی کن اور تخلیقی صلاحیتوں کا حامل جدید اسلام پاکستان میں صرف اسی طرح

بروئے کار آ سکتا ہے، اگر قدیم اور جدید کی مختصمت ختم ہو جائے اور دونوں مل کر ملت

کے کاررواں کو آگے بڑھائیں۔